بدظنی غیبت سے بچیں مکارم اخلاق کی پیروی سے اپنے لئے جنت پیدا کریں

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۴ رجنوری ۱۹۸۶ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کی:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ
مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ
عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ
وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ
وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا
تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ
اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ
وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۴﴾ (الحجرات: ۱۱-۱۴)

پھر فرمایا:

قرآن کریم کی یہ چند آیات جو میں نے تلاوت کی ہیں ان میں حسن معاشرت کے تمام بنیادی اصول بیان فرما دیئے گئے ہیں اور ان تمام باتوں سے روکا گیا ہے جس سے انسانی معاشرہ کسی نہ کسی رنگ میں بیمار پڑ جاتا ہے اور خوشی کی بجائے دکھوں اور تکلیفوں کا موجب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرت کی بنیاد ہی اس تصور پر ہے کہ ایک انسان جو اپنی اکیلے ایک بھلائی کو نہیں پا سکتا اجتماعی کوشش سے وہ بھلائی اس کو نصیب ہو جائے ورنہ فی الحقیقت تو انسان ایک خود غرض جانور ہے۔ اگر اکیلا رہ کر اس کا بس چل سکتا کہ سب خیر اس کو حاصل ہو جاتی تو وہ کسی دوسرے کی خاطر کسی تکلیف کو بھی برداشت نہ کرتا اور اپنے آرام میں کسی دوسری چیز کو مخل نہ ہونے دیتا لیکن چونکہ خدا تعالیٰ نے ایک فرد کو دوسرے فرد پر انحصار کرنے والا بنایا ہے اس لئے کہ خدا کے سوا کوئی نہیں جو کسی دوسرے کی احتیاج سے بالا ہو اس لئے ایک انسان کو دوسرے انسان کی احتیاج رہتی ہے لیکن اس احتیاج کی بنیاد خیر پر واقع ہوئی ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ خیر بڑھے نہ یہ کہ تکلیف بڑے۔ پس معاشرے میں جب بھی کوئی ایسا عمل جاری ہو یا کوئی ایسا فعل انسان سے سرزد ہو جس کے نتیجے میں دکھ پیدا ہوتا ہے تو یہ معاشرت کے اصول کے بالکل برعکس چیز ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آج کی دنیا میں معاشرہ بالعموم بدیاں پھلانے کا موجب بن چکا ہے اور خیر پھیلانے کا اور خیر کے حصول کا ذریعہ کم رہ گیا ہے۔

قرآن کریم چونکہ بنیادی اصولوں سے تعلق رکھنے والی کتاب ہے اور ہر زمانے پر حاوی ہے اس لئے قرآن کریم نے حسن معاشرت کے اصول کو بیان فرمایا ہے اور ان چیزوں سے رکنے کی تاکید فرمائی جن کے نتیجے میں معاشرہ خراب ہو سکتا ہے۔ پہلی بات معاشرے کی تباہی کی موجب افتخار بیان فرمائی گئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ

دیکھو ایک قوم دوسرے پر بڑائی محسوس کر کے اس رنگ میں اس کی تحقیر نہ کرے، اس رنگ میں اس پر نہ ہنسے گویا وہ اس سے ادنیٰ ہے۔ بظاہر تو یہ اک چھوٹی سی بات ہے لیکن آج کی دنیا میں خصوصاً مغربی دنیا میں اس آیت کا یہ ٹکڑا بڑی شدت کے ساتھ عمل دکھا رہا ہے۔ ساؤتھ افریقہ میں

جتنے دکھ پھیلے ہیں اور ابھی تک South Africa جن دکھوں سے گزر رہا ہے اس کی بنیاد یہی قومی تفاخر ہے۔ ایک قوم کو خیال ہے کہ وہ دوسری قوم سے بہتر ہے۔

اسرائیل کے قیام کا تصور بھی اسی غلط خیال کا نتیجہ ہے۔ اسرائیلی قوم کو بھی یہ گمان ہے کہ وہ خدا کے دوسروں بندوں سے بہتر ہے اس لئے محض قومیت کی بناء پر انہوں نے اپنا ایک عالمی مرکز قائم کرنے کا حق دنیا سے تسلیم کروایا اور محض نسلی امتیاز کی بناء پر وہ اکٹھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت میں سے مذہب کا حصہ اب تقریباً عنقاء ہو چکا ہے۔ ایک نسل کے فخر کا ایک احساس ان کے دلوں میں ایسا شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ آج دنیا پر جو تفوق چاہتے ہیں جو تسلط پیدا کرنا چاہتے ہیں خالصۃً نسلی امتیاز کے نظریہ پر یہ کوشش کی جارہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسی اعلیٰ نسل کے لوگ ہیں کہ تمام دنیا پر حکومت کا حق رکھتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ نازیوں کے ذریعے خدا تعالیٰ کی تقدیر نے ان کو مار پڑوائی جن کا اپنا یہی نظریہ تھا۔ بعض کے ذریعے بعض کو جب خدا سزا دلواتا ہے تو ویسے ہی بعض کو چنتا ہے ان کے لئے۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ لکڑی سے آپ لوہا کاٹیں اس لئے جب ایک بد کو دوسرے بد سے سزا دلوانی ہے تو ان میں ایک ہی جیسی خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ ایسی خصلتوں کے لوگ خدا اختیار فرماتا ہے جو کسی دوسرے بد کے پلے کے ہوں، جس طرح خدا کی تقدیر چاہے سزا دے بھی سکتے ہوں۔

اسی طرح مغربی ممالک میں جو نسلی امتیاز کے نتیجے میں آئے دن لڑائیاں ہوتی ہیں قتل و غارت ہوتے ہیں۔ انگلستان میں کیا ہو رہا ہے، مغربی جرمنی میں کیا ہو رہا ہے، دیگر ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ ان سب کی بنیاد یہ نسلی تفاخر کا تصور ہے۔ اشتراکی دنیا جو دو نیم ہو چکی ہے اور یورپین اشتراک، اشتراکی نظریہ بنیادی طور پر اگر چہ مشرقی اشتراکی نظریہ کے مطابق ہے اس سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے باوجود چین میں اشتراکیت اور روس میں اشتراکیت میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ چینی اشتراکیت روسی اشتراکیت کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نہیں آگے بڑھ سکتی۔ اتنے شدید بنیادی اختلاف پیدا ہو چکے ہیں کہ ایک دوسرے کے دشمنوں کے ساتھ وہ دوست بن سکتے ہیں لیکن آپس میں نظریہ کے اشتراک کے باوجود ایک دوسرے کے دوست نہیں بن سکتے۔ اس کے پس منظر میں بھی یہی نسلی امتیاز کا تصور ہے جو کارفرما ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ روس اگر چہ دنیا میں

اشتراکیت کا غلبہ چاہتا ہے لیکن زرد رنگ کی اشتراکیت کا غلبہ نہیں چاہتا بلکہ سفید فام اشتراکیت کا غلبہ چاہتا ہے۔ جیسا کہ غالبؔ نے کہا ہے:

؎ آئیں وہ یہاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

(دیوان غالب صفحہ:۱۸۹)

آئیں تو سہی لیکن اس طرح نہ آئیں کہ رقیب کے ساتھ آئیں۔ پس روس بھی رزد فام قوموں کے غلبہ کو خواہ وہ اشتراکیت کے نام پر ہو، اشتراکیت کی وجہ سے ہو کسی صورت میں قبول نہیں کرسکتا۔ پس نظریات کی دنیا ہو یا سیاست کی عام دنیا ہو۔ کسی پہلو سے آپ دیکھیں آج دنیا میں بڑے بڑے اختلافات جو نہایت ہی خوفناک جنگوں پر منتج ہو سکتے ہیں، جو عالمگیر تباہیوں پر منتج ہو سکتے ہیں ان کی بنیاد نسلی افتخار کے تصور پر قائم ہے۔

پس قرآن کریم نے فرمایا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ایک قوم اپنے آپ کو دوسری قوم سے بڑا سمجھتے ہوئے اس کی تحقیر نہ کرے۔ اس کو اپنے سے ادنیٰ نہ جانے۔ اس کے معاً بعد قرآن کریم فرماتا ہے کہ کوئی عورت کسی عورت کے اوپر تفاخر اختیار نہ کرے اور اس سے مذاق ان معنوں میں نہ کرے کہ وہ اس کی تحقیر کر رہی ہو۔ قوموں کے مقابل پر عورت کو رکھ دینا بظاہر یہ ایک بے جوڑ بات دکھائی دیتی ہے۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ قومی تفاخر کے بعد معاشرتی تفاخر۔ قومی تفاخر کا ذکر ہے عالمی حیثیت سے اور معاشرتی تفاخر کے طور پر عورت کو پیش کیا گیا ہے ایک نمائندہ کے طور پر کیونکہ معاشرے میں جتنی بھی برائیاں پھیلتی ہیں ایک دوسرے پر بڑائی دکھاتے ہوئے وہ عورت کی طرف سے زیادہ تر رونما ہوتی ہیں اور عورت کا مزاج اس بات کے قریب تر ہے کہ وہ دوسرے کے اوپر، دوسرے خاندانوں کے اوپر، دوسری عورتوں لڑکیوں کے اوپر، اپنی بڑائی خاندانی طور پر ظاہر کرے اور اپنے آپ کو بہتر سمجھے۔ بہت کم آپ کو مرد ایسے نظر آئیں گے جو خاندانی طور پر اپنی فوقیت جتانے کے نتیجے میں کسی لڑائی کو پیدا کرنے والے بنے ہوں لیکن معاشرے کو اکثر لڑائیاں عورتوں کے ان طعنوں کے نتیجہ میں ہوتی ہیں کہ تم کس خاندان کی ہو اور وہ کس خاندان کا ہے۔ اس کی ذات کیا ہے، اس کی قومیت کیا ہے اور رشتے ڈھونڈتے وقت بھی یہ ساری باتیں چلتی ہیں اور اگر رشتہ ہو جائے تو پھر بھی مسلسل یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تو جہاں بڑائی زیادہ شدت کے ساتھ پائی جاتی تھی اسے نمایاں

کرنے کی خاطر، مرض پر انگلی رکھ دینے کی خاطر خدا تعالیٰ نے معاشرے کی برائی کا ذکر کرتے ہوئے عورت کو بطور مثال پیش فرمایا اور اسے تنبیہ کی کہ دوسری عورتوں کے اوپر فوقیت نہ دکھایا کرو۔

ان دونوں جملوں کے ساتھ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ، عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس میں خدا تعالیٰ ایک عظیم الشان قومی تغیرات کا گر بیان فرماتا ہے، راز بیان فرماتا ہے۔ جس طرح رات دن میں بدلتی ہے اور دن رات میں اسی طرح یہ قومی تفاخر بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ خیال غلط ہے کہ ایک قوم ہمیشہ کے لئے دوسری قوم پر ایسی فضیلت اختیار کر جائے کہ ان کے اندر ایک تفاخر کی وجہ پیدا ہو جائے۔ ذاتوں کے فخر بھی بدلتے رہتے ہیں، قوموں کے فخر بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے بدلنے کی رفتار اتنی آہستہ ہے کہ عموماً انسان اپنی زندگی میں ان کو محسوس نہیں کر سکتا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اگر پیچھے مڑ کر دیکھے تو خود اپنے زمانے میں ہی ان تغیرات کو پیدا ہوتا ہوا محسوس کر سکتا ہے۔

آج سے چالیس سال پہلے یا پچاس سال پہلے ہندوستان میں ذات پات کی جس قدر تمیز پائی جاتی تھی آج اس کا عشر عشیر بھی باقی نہیں رہا۔ انگلستان میں جو نوابی کے تصورات سو سال پہلے پائے جاتے تھے آج اس کا سوواں حصہ بھی باقی نہیں ہے۔ وہ قومیں وہ لوگ وہ پیشے جن کو بہت تحقیر سے دیکھا جاتا تھا آج وہ معزز ترین پیشے بن گئے ہیں، معزز ترین قومیں بن گئی ہیں۔

پس قرآن کریم جب یہ فرماتا ہے عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ تو مراد یہ ہے کہ یہ قدریں کوئی باقی رہنے والی قدریں نہیں ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے ایسا بنایا ہوتا کہ ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت دی ہوتی اور ایک قوم اور ذات کو دوسری قوم اور ذات پر فوقیت دی ہوتی تو ان کے تبدیل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں اللہ کی بنائی ہوئی تقدیر کو تو کوئی بدل نہیں سکتا۔ خدا کی سنت تو غیر محول اور غیر مبدل ہوتی ہے۔ تو فرمایا کہ ان کے جھوٹا ہونے کا ان کے بے معنی اور بے بنیاد ہونے کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں بدل جائیں گی۔ آج وہ لوگ جو فخر کر رہے ہیں دوسروں پر عین ممکن ہے کہ کل وہی لوگ ان پر فخر کر رہے ہوں اور ان کو تحقیر سے دیکھ رہے ہوں، حقیر جان رہے ہوں۔ تو یہ جو عالمی تصورات ہیں جو رفتہ رفتہ رونما ہونے والے ہیں۔ بعض دفعہ سینکڑوں سال میں بعض دفعہ ہزاروں سال میں بالکل نظریات کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ ان

تصورات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یہ باقی رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔فخر کی چیز تو وہی ہوسکتی ہے جو باقی رہنے والی ہو۔ یہ تو عارضی واقعات ہیں، عارضی رونما ہونے والے عوارض ہیں اس سے بڑھ کران کی کوئی حیثیت نہیں۔

پھر قرآن کریم فرماتا ہے کہ وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ایک دوسرے پر الزام تراشی نہ کیا کرو۔ طعنے نہ دیا کرو،لمز کا مطلب ہے کہ طعن کرنا۔کسی کو کاٹنا زبان سے ، چرکے لگانا، دکھ پہچانے کی خاطر بات کرنا۔ وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ تم ایک دوسرے کو دکھ پہچانے والی باتیں نہ کیا کرو۔وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔اور نام اس خاطر نہ رکھا کرو کہ ناموں کے ذریعے کسی کی تحقیر ہو اور یہ جو بیماریاں ہیں یہ قوموں میں بھی پائی جاتی ہیں اور افراد میں بھی پائی جاتی ہیں، عالمی سطح پر بھی پائی جاتی ہیں اور معاشرتی سطح پر بھی پائی جاتی ہیں۔بعض لوگ بعض قوموں کے نام رکھتے ہیں یہ بتانے کی خاطر کہ یہ ذلیل اور ادنیٰ لوگ ہیں۔ چنانچہ Nigger حبشی کو کہا جاتا ہے۔سیاہ فام قوموں کو تو Nigger کا لقب ہی تکلیف دینے کی خاطر ہے۔اور جب امریکہ یا کینیڈا میں Paki کہتے ہیں کسی کو یعنی پاکستانی تو بڑی شدید گالی سمجھی جاتی ہے۔یعنی بدقسمتی سے پاکستانیوں کا وہاں کردار ایسا رہا ہے یا کوئی اور وجوہات پیدا ہوئی ہیں کہ اس کے نتیجے میں ایک سفید فام قوم نے ہماری قوم کا نام Paki رکھ دیا ہے اور یہ بھی تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ کی ایک ذلیل مثال ہے۔نتیجۃً سکھوں کو بھی Paki کہتے ہیں جو بے ہودہ کام کر رہے ہوں۔ ہندو ہوں تب بھی ان کو بھی Paki کہیں گے۔کسی اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ برائی کی نشانی Paki بن گئی ہے۔گویا نعوذ باللہ پاکستانی ہر برائی کا مرجع اور منبع ہے، ہر برائی اسی سے پھوٹتی ہے اور اسی میں لوٹ کر آتی ہے۔اور انفرادی طور پر غلط نام رکھنے یہ تو عام رواج ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے۔سکولوں میں تو یہاں تک رواج تھا کہ ہر استاد کا ایک ایک نام رکھا ہوتا تھا اور اصل نام سے بعض لوگ استادوں کو جانتے ہی نہیں تھے،اس برے نام سے جانتے تھے اور یہاں تک کہ کئی سال گذرنے کے بعد ایک نسل بوڑھی ہوگئی تب بھی استاد کا اصل نام تو یاد نہیں رہا یہ لقب یاد رہ گیا کہ فلاں صاحب یہ تھے اور فلاں صاحب یہ تھے۔تو یہ معاشرے کی برائیاں ہیں جن کے نتیجے میں ہر طرف کس گھولی جاتی ہے، زہر پھیلتا ہے۔ خاندان خاندانوں سے لڑتے ہیں۔ بیوی خاوند سے لڑتی ہے، ساس بہو سے لڑتی ہے اور سارے گھر کا

امن برباد ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ

کہ اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو بے وجہ خیال آرائیاں نہ کیا کرو۔ اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ تم وہموں میں ہی مبتلا رہ کر زندگی گذار دو گے۔ سوچتے رہتے ہو کہ فلاں نے یہ بات کیوں کی ہوگی، کس لئے کی ہوگی، کس بری نیت سے کی ہوگی۔ یا فلاں کا یہ فعل کیوں ہوا ہوگا اور اس کے نتیجے میں اپنے ذہنوں میں بھی کہانیاں بنتے رہتے ہو اور ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں پالتے رہتے ہو۔ چنانچہ معاشرے میں بہت سی برائیاں گھروں میں كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ ظن بالکل نہ کرو کیونکہ استنباط ایک ظن کا حصہ ہے بعض مواقع پر بعض علامتیں ظاہر ہوں تو ظن کے بغیر چارہ نہیں لیکن خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ظنوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اپنی زندگی کو ظنوں کے سپرد نہ کر دو گویا کہ تم ظنوں کے ہو کر رہ گئے ہو۔ توہمات، بے بنیاد باتیں سوچنا اور یہ نہیں فرمایا کہ ہر ظن گناہ ہے فرمایا اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ بہت زیادہ ظن کی عادت ڈالو گے تو بعض ظن ایسے ہونگے، بعض گمان ایسے ہوں گے جو گناہ بھی ہو جائیں گے۔ اس لئے ہمارے محاورے میں حسن ظن اور سوئے ظن دو محاورے پائے جاتے ہیں تو جب فرمایا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ تو مراد یہ ہے کہ سوئے ظن سے بچو اور یہ کہنے کی بجائے کہ سوئے ظن سے بچو جب یہ فرمایا کہ اکثر ظن نہ کیا کرو، تو مراد یہ ہے کہ عموماً ظن کی عادت اچھی نہیں ہے۔ ایک بہت لطیف رنگ ہے یہ بات کو بیان کرنے کا اور اگر آپ جدید رجحانات سائنس کے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت ہی گہری سچائی ہے اس طرز بیان میں۔

جو لوگ ظن پر مائل ہوتے ہیں وہ شواہد کی تلاش چھوڑ دیتے ہیں اور جو لوگ شواہد کو فوقیت دیتے ہیں وہ ظن سے اکثر بچتے ہیں، مجبور ہو جائیں تو ظن کرتے ہیں ورنہ وہ شواہد کے پیچھے چلتے ہیں، شواہد کی جستجو میں رہتے ہیں۔ تو یہ بنیادی اصول ہے جو قوموں کے لئے بہت ہی فائدہ مند ثابت ہو سکتا

ہے۔ اگر وہ اس کی کنہ کو پا جائیں۔ سائنس نے تمام ترقی اس بات پر کی ہے کہ شواہد کی تلاش کی ہے اور اگر کوئی ظن پیدا بھی ہوا ہے تو اس کا نام وہ Hypothesis رکھتے ہیں اور ظن پیدا ہونے کے بعد اس پر انحصار نہیں کرتے بلکہ شواہد کی جستجو شروع کر دیتے ہیں اور جب شواہد کسی حد تک گواہ مل جائیں کہ ہاں اس ظن کے صحیح ہونے کا امکان موجود ہے تو پھر اسے کہتے ہیں اس کا نام Theory یا نظریہ ہے۔ اور پھر بھی شواہد کی تلاش نہیں چھوڑتے یہاں تک کہ اور بڑھتے ہیں اور وسیع نظر کرتے ہیں۔ ماضی کے شواہد بھی دیکھتے ہیں، حال کے شواہد بھی دیکھتے ہیں، مستقبل میں جو رخ اختیار کر سکتے ہیں تجارب ان پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ ہر لحاظ سے ہر پہلو سے وہ نظریہ درست تھا اور اس کے بدلنے کا کوئی امکان نہیں تو اس کا نام Law رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ سائنس کا قانون ہے۔ اگر اس کے برعکس ظن پر راضی رہنے والی قومیں ہوتیں جیسا کہ مشرق میں بدقسمتی سے یہ بیماری پائی جاتی ہے تو اپنے ظن کے مطابق وہ شواہد کو موڑنے کی کوشش کرتے اور جس طرح روحانی دنیا میں گناہ ہوتے ہیں مادی دنیا میں بھی گناہ ہوتے ہیں مادی دنیا میں بھی بعض ظن سوٴ بن جاتے ہیں۔

چنانچہ جتنا کیمیا گروں نے مشرق کی دولتوں کو لٹایا ہے اور خاک کے سوا ان کے پلے کچھ بھی نہیں پڑا یہ سارا اسی گناہ کی پاداش ہے کہ وہ ظن میں مبتلاء ہوئے كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ کے عادی ہو گئے اور بعض ظن جو غلط تھے ان کو درست کرنے کی بجائے ان کی پاداش انہوں نے دیکھی اور قوموں کو بلندی سے تنزل کی راہ پر اتار دیا۔ تو ظن کی عادت بڑی بری چیز ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے یہ نہیں فرمایا کہ برا ظن نہ کرو۔ فرمایا کہ ظن سے بچنے کی کوشش کرو، جہاں تک ممکن ہے جستجو کرو، جہاں تک ممکن ہے حقائق کی تلاش کرو۔ حقائق کی جستجو تمہاری عادت ہونی چاہئے اور ظن تمہاری عادت نہیں ہونی چاہئے۔ اگر ظن تمہاری عادت بن گیا تو پھر لازماً تم بعض برے ظنوں میں بھی مبتلا ہو گے جن کی پاداش دیکھو گے۔ اور بدقسمتی سے مشرقی دنیا میں معاشروں کی تباہی کا ایک بڑا موجب ظن کی کثرت ہے۔

وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا یہ اسی کی پیداوار ہے۔ حقائق کا سامنا کرنے کی جن قوموں کو عادت نہیں رہتی وہ پھر منہ پر بات کرنا بھی نہیں جانتے۔ وہ Escape اختیار کرتے ہیں شواہد سے اور یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کی بات Challange ہو جائے گی۔ اس لئے فرضی باتوں کے عادی پیٹھ پیچھے باتیں کرتے ہیں، چھپ کر باتیں کرتے ہیں، چھپ کر طعن تشنیع

کرتے ہیں۔ اور لمز کی یہ انتہا ہے۔ لمز کہتے ہیں طعن وتشنیع جو منہ پر کی جائے۔ جب یہ بدی بڑھ جاتی ہے اور ناسور بن جاتی ہے یا Cancer ہو جاتی ہے تو اس سوسائٹی میں پھر سامنے کی طعن وتشنیع کو چھوڑ کر پھر غیب میں باتیں کی جاتی ہیں اور دوسرے کو اپنے دفاع کا کوئی موقع ہی نہیں مل سکتا۔ یہ سب سے بڑی بدصورت اس بیماری کی ہے اور اس کا ظن سے گہرا تعلق ہے۔

فرماتا ہے:

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ط اس کے متعلق میں گذشتہ خطبہ میں تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ عجیب مثال دی ہے قرآن کریم نے يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ کہ کیا تم اپنے لئے یہ بات پسند کرلو گے کہ تم اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا رہے ہو۔ چونکہ اس مضمون کا عنوان یہ باندھا گیا تھا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ دیکھو مومن بھائی بھائی ہیں اس لئے بھائیوں کے درمیان اصلاح کی کاروائی کرو۔ ہر ایسی بات کرو جس سے بھائی ایک دوسرے پر راضی رہیں۔ اس لئے یہاں بھائی سے مراد سگا بھائی نہیں ہے۔ ہر مومن بھائی ہے اور بھائی کہہ کر اس کے گوشت کی طرف توجہ دلانے کا مطلب یہ ہے کہ مردہ بھائی کا گوشت، اول تو بھائی کا گوشت کھانا ویسے ہی مکروہ چیز ہے۔ مردہ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ وہ اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ جو مرضی اس سے کرو اس کو کچھ پتہ نہیں۔ چنانچہ اس کراہت کو نمایاں کر کے دکھا دیا۔ ورنہ خالی یہ کہہ دیا جاتا کہ تم اپنے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتے ہو؟ مردہ بھائی کا گوشت کہہ کر اس کی بے چارگی کو بھی ظاہر کیا جس کے خلاف باتیں کی جارہی اور اس کی لذت کی حقیقت کو بھی ظاہر کیا کہ جسے یہ طیب غذا اپنے لئے سمجھ رہا ہے کہ کسی کے خلاف غیب میں باتیں کر کے اس کی برائیاں کر کے مزہ اٹھا رہا ہے۔ یہ ایک ایسی مکروہ چیز ہے کہ مردے کا گوشت کھانے والی بات ہے اور وہ بھی بھائی مردہ ہو۔ ایسی وضاحت و بلاغت کا مرقع ہے یہ کلام کہ ایک بات کو جب بیان فرماتا ہے تو انتہاء تک پہنچا دیتا ہے اور کتنے چھوٹے سے جملے میں اس برائی کی کتنی تفصیل کے ساتھ مذمت فرما دی گئی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ وہ بار بار توبہ کو قبول کرنے والا ہے اور رحم کرنے والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ہم نے تمہیں اے انسانو اس لئے پیدا کیا تھا مرد اور عورت میں وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ اور تمہیں قبائل میں اور قوموں میں اس لئے تفریق کیا تھا لِتَعَارَفُوْا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ یقیناً تم میں سے سب سے معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ یقیناً اللہ بہت جاننے والا اور بہت خبر رکھنے والا ہے۔

اس آیت میں عموماً مختلف علماء شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ کو اپنے خطابات کے لئے نمایاں حیثیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہیں جو تفریق کیا گیا ہے قوموں میں اس کی وجہ یہ نہیں کہ تم میں سے ایک دوسرے پر عزت پائے بلکہ اس کی اور وجہ ہے اور پہلے حصے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى ہم نے تمہیں مرد اور عورت پیدا کیا۔ اس لئے اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ترجمہ کرنے والا یا تقریر کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اس کا لِتَعَارَفُوْا سے تعلق کوئی نہیں۔ یہ گویا کہ ضمناً ذکر چل پڑا ہے۔ اس کا اس مضمون سے تعلق کوئی نہیں۔ مرد اور عورت کو اس لئے تو نہیں پیدا کیا کہ تا ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ ہاں شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ اس لئے پیدا کیا تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ ایک انداز ہے کہ بعض مضامین جو واضح ہوتے ہیں ان کا ذکر چھوڑ دیتا ہے اور ایک مضمون کے تسلسل میں ایک بات نتیجہ نکالے بغیر بیان فرما دیا کرتا ہے۔ چونکہ مضمون یہ چل رہا ہے کہ ایک دوسرے پر بڑائی نہ کر، ایک دوسرے کے اوپر اپنی فضیلت نہ جتاؤ، ایک دوسرے کو حقیر نہ جانو، اس لئے پہلا حصہ اس جملے کا اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى یہ معنی رکھتا ہے کہ جس طرح قوموں میں کوئی فخر نہیں ہے اس طرح مرد اور عورت ہونے میں بھی کوئی فخر نہیں ہے۔ محض اس بنا پر کہ کوئی مرد ہے اسے کوئی فضیلت نہیں ہے کسی دوسرے انسان پر یا محض اس بناء پر کہ کوئی عورت ہے کسی دوسرے انسان پر فضیلت نہیں ہے۔

یہ جو آج کل مغربی دنیا میں یہ بحث چل رہی ہے کہ عورت بہتر یا مرد بہتر کہ دونوں میں برابری ہو۔ قرآن کریم اس مضمون کو اس رنگ میں پیش نہیں فرماتا جس رنگ میں مغربیت کا رخ جا رہا

ہے۔لیکن بنیادی طور پر عورت اور مرد کے برابر حقوق کو ضرور تسلیم کرتا ہے اور یہاں یہ ذکر اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مرد کو عورت پر بھی کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ چونکہ تم مرد ہو اس لئے تمہیں حق ہے کہ کسی عورت کی تحقیر کرو اور اس کی تذلیل کرو۔ جس طرح بعض قوموں میں بعض محاورے پائے جاتا ہیں جو عورت کی برائیوں کے اظہار پر وقف ہوتے ہیں یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت ذات ہے تو اس میں یہ بات ضرور پائی جائے گی۔ مقابل پر عورتوں نے شاید مردوں کے لئے بھی کچھ ایجاد کئے ہوں گے۔ مگر قرآن کریم فرماتا ہے اس حیثیت سے ہرگز کوئی تفریق نہیں ہوسکتی۔ عزت کے لحاظ سے، بلند مرتبے کے لحاظ سے، صرف اور صرف ایک معیار ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ وہی تم میں سب سے معزز ہے جو زیادہ خدا کا خوف رکھنے والا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور خوب خبر رکھتا ہے اس بات کی کہ تم لوگ کیا کرتے ہو، کیوں کرتے ہو، تمہارے اعمال کی کنہ کیا ہے، مقصد کیا ہے تمہاری باتوں اور تمہارے افعال کا، ہر بات سے اول سے آخر تک خوب باخبر ہے اور ان کے پیدا ہونے والے نتائج سے بھی باخبر ہے۔ دور دراز اثرات جو ان کے مرتب ہوں گے ان پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔

آنحضرت ﷺ چونکہ صفات باری کے مظہر اتم تھے ان معنوں میں کہ انسان کو جتنی بھی استطاعت ہے خدا کی صفات میں رنگین ہونے کی اس کو آنحضرت ﷺ نے درجہ کمال تک پہنچا دیا اور درجہ کمال تک پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ صفات حسنہ میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ اور قرآن کریم نے بھی اسی مضمون کو آنحضرت ﷺ کے حق میں باندھا اور حضرت رسول اکرم ﷺ نے بھی اسی مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔

انّما بعثتُ لِاتمم مکارم الا خلاق

ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں اعلیٰ ترین اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔ حضرت امام مالک مؤطا میں یہی روایت درج فرماتے ہیں مگر ایک لفظی فرق کے ساتھ۔ وہ فرماتے ہیں ہمیں تو یہ بات پہنچی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا **بعثت لاتمم حسن الاخلاق** (مؤطا امالک الکتاب الجامع) کہ میں اس لئے مبعوث فرمایا گیا ہوں کہ میں اخلاق کے حسن کو اس کے درجہ کمال تک پہنچا دوں۔ بنیادی طور پر مضمون ایک ہی ہے۔

پس صفات باری تعالیٰ میں رنگین ہونے کا مطلب جہاں ایک طرف الوہیت سے تعلق قائم کرنا ہے وہاں دوسری طرف عبدیت سے تعلق قائم کرنا بھی ہے اور اخلاق کا بہترین ہونا اس کا ایک طبعی اور لازمی نتیجہ ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی انسان باخدا تو بن رہا ہو، خدا کی صفات میں تو رنگین ہو رہا ہو لیکن دنیا کے لحاظ سے نہایت بدخو ہو اور انسانوں کے لئے اس کا گوشہ نرم نہ ہو۔

اس لئے صفات باری تعالیٰ کا جو مضمون میں بیان کر رہا ہوں اس کا یہ مقصد ہے کہ جماعت احمدیہ ان صفات میں اس طرح رنگین ہو کہ اس کا ایک رنگ بنی نوع انسان پر بھی ظاہر ہو رہا ہو ساتھ ساتھ۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اندرونی طور پر انسان میں کوئی پاک تبدیلی ایسی پیدا ہو کہ خدا تعالیٰ سے اس کا تعلق بڑھ رہا ہو اور اس کے باوجود بنی نوع انسان سے اسکا تعلق کم ہو رہا ہو۔ خدا تعالیٰ کے لئے اس کا دل نرم ہو رہا ہو اور بنی نوع انسان کے لئے اس کا دل سخت ہو رہا ہو۔ یہ متضاد باتیں ہیں یہ ایک وقت میں ممکن ہی نہیں ہے۔

اس لئے صفات باری تعالیٰ کے سب کامل اور سب سے حسین مظہر حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کو دیکھیں تو یہ عقدہ حل ہو جائے گا۔ جتنا زیادہ آپؐ خدا کی صفات میں رنگین ہوئے اتنا ہی زیادہ حسن اخلاق کی دولت آپؐ کو عطا فرمائی گئی بلکہ یہاں تک عظمت آپؐ کو عطا کی گئی کہ خدا تعالیٰ نے خود فرمایا کہ تجھے ہم نے عظیم اخلاق پر قائم فرمایا ہے۔ عظیم سے بڑھ کر حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کے اخلاق کے لئے کوئی اور لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

’’ اللہ جل شانہ ہمارے نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے :
وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ یعنی تو ایک بزرگ خلق پر قائم ہے۔ سو اس تشریح کے مطابق اس کے معنی ہیں یعنی یہ کہ تمام قسمیں اخلاق کی سخاوت، شجاعت، عدل، رحم، احسان، صدق، حوصلہ وغیرہ تجھ میں جمع ہیں۔ غرض جس قدر انسان کے دل میں قوتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ ادب، حیا، دیانت، مروت، غیرت، استقامت، عفت، ذہانت، اعتدال، مواسات یعنی ہمدردی۔ ایسا ہی شجاعت، سخاوت، عفو، صبر، احسان، صدق، وفا وغیرہ جب یہ

تمام طبعی حالتیں عقل اور تدبر کے مشورہ سے اپنے اپنے محل اور موقع پر ظاہر کی جائیں گی تو سب کا نام اخلاق ہوگا اور یہ تمام اخلاق درحقیقت انسان کی طبعی حالتیں اور طبعی جذبات ہیں اور صرف اس وقت اخلاق کے نام سے موسوم ہوتے ہیں کہ جب محل اور موقع کے لحاظ سے بالارادہ ان کو استعمال کیا جائے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ: ۳۳۳)

پس آنحضرت ﷺ کے متعلق قرآن کریم نے جب فرمایا وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ۵) تو ان تمام صفات حسنہ کا ذکر فرما دیا جو انسان میں جمع ہو سکتی ہیں۔ جس کے چند نمونے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمائے اور جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تفسیر فرمائی محض ان اخلاق کا، ان صفات حسنہ کا آنحضرت ﷺ کو مجمع قرار نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا کہ یہ اخلاق اپنے اپنے محل پر حضرت رسول کریم ﷺ کو عطا کئے گئے۔ ایک بزرگ خلق پر قائم ہے۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان ترجمہ ہے کہ اس ترجمہ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سلطان القلم بنا رہا یا کس طرح آپ کو سلطان القلم اس نے بنایا تھا۔ آپ ترجمے اٹھا کر دیکھ لیں جہاں جہاں بھی خلق عظیم کا ترجمہ آئے گا وہاں لفظ بزرگ کی طرف کسی کا خیال نہیں جائے گا۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر اس محل اور موقع پر خلق عظیم کا ترجمہ ممکن نہیں۔ تجھے بزرگ خلق پر قائم کیا گیا۔ بڑی عظمت ہے اس لفظ بزرگ میں بڑی گہرائی ہے اور عظیم کا اس سے بہتر اور ترجمہ ممکن نہیں۔

پس آنحضرت ﷺ کو بزرگ خلق پر قائم فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر خلق جو اپنی انتہا کو پہنچا ہے، جو بلند مرتبے تک پہنچ چکا ہے اس خلق پر آنحضرت ﷺ کو قائم فرمایا گیا اور خود حضور کے اپنے الفاظ **انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق** اسی بات کا مظہر ہیں کہ مجھے مبعوث فرمایا گیا کہ میں مکارم اخلاق کا اتمام کروں اور ان کو انتہا تک پہنچا دوں۔

مکارم اخلاق سے کیا مراد ہے۔ مکارم اخلاق سے مراد ہے وہ خلق جو عزت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوں۔ معزز ترین اخلاق، بزرگ ترین اخلاق۔ جو بزرگ ترین مقام تک دنیا کے لحاظ سے پہنچ چکے تھے اور آج تک کوئی دوسرا اس سے آگے ان کو نہیں بڑھا سکا تھا، میں انہیں بھی کامل کر کے

دکھادوں۔انہیں نئی بلندیوں تک پہنچا کے دکھاؤں اور بتاؤں کہ کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا، جو میرا منتظر تھا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ دنیا میں ظاہر ہوں اور اخلاق کو ان چوٹیوں سے اٹھائیں جن پر ان کو گزشتہ بزرگوں نے قائم کیا تھا اور نئے بلند تر مقامات تک ان کو پہنچا دیں۔ یہ منصب ہے حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کا اور ہم ایک ایسی قوم ہیں، ایسی خوش نصیب قوم ہیں جو ایسے بلند صاحب اخلاق انسان کے غلام کہلانے کے مستحق ٹھہرے لیکن مستحق ٹھہرے یا نہیں یہ ایک الگ سوال ہے۔

مستحق ٹھہرنا چاہئے جن کو کیونکہ آنحضرت ﷺ کی پیروی کا دعویٰ کرنے کے بعد آج مسلمان جو اخلاق میں دنیا میں سب سے ذلیل ترین قوموں میں شمار ہونے لگا ہے۔ یہ اتنا بڑا تضاد ہے، اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس ظلم کا اگر آپ تصور کریں تو آپ رؤاں رؤاں خدا کے خوف سے کانپنے لگے۔ ایک معمولی ماں باپ کے بیٹے سے جب کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو لوگ اسے طعنہ دیتے ہیں دیکھتے نہیں تم کس باپ کے بیٹے ہو اور اس طعنہ پر بعض لوگ کٹ مرتے ہیں۔ اس باپ کی حیثیت کیا ہے محمد مصطفیٰ ﷺ کے بزرگ اخلاق کے مقابل پر اور عظمتوں کے مقابل پر۔

یہ طعنہ آج اسلام کو مل رہا ہے، یہ ظلم کیا جا رہا ہے آج اسلام پر کہ مسلمانوں کو نمایاں کر کے، مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ تم وہ مسلمان ہو جو کہتے ہو کہ تمام دنیا میں بلند ترین اخلاق پر فائز کئے گئے تھے۔ تم وہ مسلمان ہو جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارے آقا و مولا تمام دنیا میں سب صاحب خلق لوگوں سے افضل اور سب پر سبقت لے جانے والے تھے۔ اپنا منہ دیکھو، اپنے اعمال دیکھو، اپنی حرکتیں دیکھو اور پھر سوچو کہ اپنے آقا کی کیا تصویر تم دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہو۔ اتنا خوفناک طعنہ ہے، اتنا دل ہلا دینے والا طعنہ ہے کہ اس کے باوجود اگر کوئی غیرت نہ دکھائے یا اس کے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا نہ ہو۔ بیدار ہو کر اگر کوئی غور سے نہ دیکھے کہ میں کون ہوں کیا ہوں اور مجھ سے کیا توقعات کی جا رہی تھیں تو ایسا آدمی تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ غفلت کی نیند میں سویا پڑا ہے اٹھ ہی نہیں سکتا اور یا پھر وہ مردہ ہو چکا ہے۔

جماعت احمدیہ کا یہ کام ہے کہ وہ اس کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرے۔ جماعت احمدیہ آج اس مقام پر فائز کی گئی ہے، اس غرض سے قائم کی گئی ہے کہ ان کھوئی ہوئی عظمتوں کو حاصل کرے جو محمد مصطفیٰ ﷺ کے غلاموں کو زیبا ہیں۔ جن کے بغیر عمل کی دنیا میں ہم حضرت محمد مصطفیٰ

ﷺ کی عظمت کو ثابت ہی نہیں کر سکتے۔ کروڑ ہا سیرت کی آپ کتابیں لکھ دیں۔ ارب ہا میلاد منائیں، ہر دن کو ایک میلاد شریف میں تبدیل کر دیں اور ہر رات کو سیرت کے نغمے گاتے ہوئے گزار دیں مگر حقیقت میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی عظمت اخلاق کا دنیا کو قائل نہیں کر سکتے جب تک آپ صاحب خلق نہ بن کے دکھائیں اور پھر یہ فخر کے طور پر پیش نہ کریں کہ یہ سب کچھ ہم نے آقا سے پایا ہے۔

ع تیرے بڑھنے سے قدم آگے بڑھایا ہم نے

یہ گیت تو تب زیب دیتا ہے اگر آپ کے قدم آگے بڑھتے ہوئے نظر آرہے ہوں لیکن بدقسمتی کی انتہا ہے، ایک عجیب دردناک المیہ ہے کہ اس آقا کے غلام ہو کر جسے مکارم اخلاق کو آگے بڑھانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ بلند ترین چوٹیاں جو اخلاق کی آپ سے پہلے تمام بنی نوع انسان نے قائم کی تھیں محمد مصطفیٰ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے اس لئے معبوث کیا گیا کہ ہر خلق کی چوٹی سے اس خلق کو اٹھاؤں اور بلند تر مقام پر کھڑا کر کے دکھادوں کہ یہ ہے اصل مقام۔ ان خلق کے غلام ہو کر، ان کی طرف منسوب ہو کر آج امت مسلمہ کے اخلاق کا یہ عالم ہو کر دنیا کی ایرا غیرا اور عام دنیا کی لامذہب قومیں بھی ان کے اوپر تمسخر کریں اور تشنیع کریں اور کہیں کہ ہاں یہ اخلاق ہیں۔ دہریہ بھی ہنس رہے ہیں آج۔ بگڑے ہوئے مذاہب والے بھی ہنس رہے ہیں اور مشرک بھی ہنس رہے ہیں، فلسفہ دان بھی ہنس رہا ہے اور دنیاوی Civilization اور تہذیب وتمدن کے علمبردار بھی ہنس رہے ہیں۔

کیا جماعت احمدیہ نے اس میدان میں آگے قدم بڑھایا ہے یا نہیں؟ یہ وہ سوال ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اتنے گوشے ابھی خلا کے باقی ہیں۔ اخلاق کی طرف توجہ دینے کا اتنا بڑا کام ابھی باقی ہے کہ اگر ہم نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تو ہم دنیا کے معلم قرار نہیں دیئے جاسکیں گے۔ اگر اس کے باوجود ہمیں دنیا کا مربی بنا دیا گیا تو یہ دنیا پر احسان نہیں ہوگا۔ اس لئے جوں جوں فتح کے دن قریب آرہے ہیں ان ان گوشوں پر میری نظر پڑتی ہے اور میں خدا کے سامنے حول سے کانپنے لگتا ہوں کہ اے خدا محض تیرا فضل ہے جو ان حالات کو تبدیل فرما دے اور ہمیں وہ عظمتیں عطا فرما جن عظمتوں کی خاطر تو نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ ورنہ ہر قدم پر کمزوریاں ہیں، ہر قدم پر رخنے ہیں۔ ایک خلا تو نہیں ہر سمت میں کئی خلا ہیں۔ جب ہم غیروں کے مقابل پر اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو یقیناً ایک عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم دوسروں کے مقابل پر اپنے اخلاق پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک طمانیت کا احساس

بھی پیدا ہوتا ہے لیکن میں آج جو بات کہہ رہا ہوں وہ یہ نہیں کہ نعوذ باللہ من ذلک جماعت احمدیہ دوسری قوموں کے مقابل پر دوسرے مذاہب اور فرقوں کے مقابل پر، آج کم اخلاق رکھنے والی ہے۔ میری نظر تو محمد مصطفیٰ ﷺ کے خلق عظیم پر ہے۔ میں اس لئے یہ موازنہ کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ ادنیٰ پر راضی ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔ اپنے سے نیچے کے اخلاق کے ساتھ آپ نے موازنہ کیا تو آپ ترقی نہیں کر سکیں گے کیونکہ آپ سمجھیں گے کہ آپ کو سب پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ اگر دیکھنا ہے ترقی کی نظر سے آگے بڑھنے کی خاطر تو ہمیشہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے اخلاق پر اپنی نظریں مرکوز رکھیں پھر دیکھیں گے آپ کہ آپ کو کتنا محرومی کا احساس بڑھے گا۔ کیا کچھ پانے کی نئی تمنائیں آپ کے دل میں پیدا ہوں گی۔ ہر وقت ایک لگن لگی رہے گی کہ ہمیں یہ بھی بننا تھا اور وہ بھی بننا تھا اور وہ بھی بننا تھا اور وہ بھی بننا تھا۔ ابھی تو ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے۔

پس یہ وہ نظریہ ہے جس کی خاطر مجھے چند باتیں آپ کے سامنے پیش کرنا ہونگی۔ آج چونکہ خطبہ کا وقت زیادہ ہو رہا ہے اس لئے میں اس مضمون کے دوسرے حصے کو آئندہ جمع تک کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

بہت سی ایسی معاشرتی خرابیاں جماعت میں پیدا ہو چکی ہیں جس نے جماعت کی عائلی زندگی کو بھی تباہ کر دیا ہے اور آئندہ نسلوں پر بہت برے رنگ میں اثر انداز ہو سکتی ہے۔ بیسیوں خط مجھے روزانہ ملتے ہیں ایسی باتوں کے جن کو پڑھ کر شدید تکلیف پہنچتی ہے۔ احمدی گھروں میں خاوند ایسے ہیں اور بیویاں ایسی ہیں اور بہوئیں ایسی ہیں اور ساسیں ایسی ہیں اور نندیں ایسی ہیں، نندوئی ایسے ہیں۔ گھروں میں وہ فیکٹریاں ہیں درحقیقت جہاں سے گلیاں سنورتی بھی ہیں اور بگڑتی بھی ہیں۔ گلیوں میں جو جرم پلتے ہیں وہ بھی دراصل گھروں سے نکل کر گلیوں میں جمع ہوا کرتے ہیں۔ گلیوں میں جو نیکی کے کام جاری ہوتے ہیں وہ بھی پہلے گھروں میں بنتے ہیں پھر گلیوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔

اس لئے اگر آپ نے معاشرے کو درست کرنا ہے تو سب سے چھوٹے یونٹ یعنی گھر پر نظر کرنی ہوگی۔ گھر کو جنت میں تبدیل کئے بغیر نہ آپ اپنے شہر کو جنت میں تبدیل کر سکتے ہیں نہ عالم کو جنت میں جنت میں تبدیل کرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اس لئے انشاء اللہ تعالیٰ حسب توفیق آئندہ خطبہ میں خصوصیت کے ساتھ چند معاشرتی بیماریوں کا ذکر کر کے میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا

کہ جلد تر ان بیماریوں سے اجتناب کریں اور استغفار کریں اور اپنے معاشرے کو حسین بنانے کی کوشش کریں۔ دنیا تو آپ کو جہنم میں مبتلا کرنے کے لئے ہر کوشش کر رہی ہے۔ کم سے کم آپ خود اپنے لئے تو جنت پیدا کریں۔ خود تو ایسے معاشرے میں بسیں جس کا نام قرآن کی رو سے جنت ہے اور جس کا شجر شجر طیبہ ہے جس کو حسین پھل لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین